OPEN ACCESS
Journal of Islamic & Religious Studies
ISSN (Online): 2519-7118
ISSN (Print): 2518-5330
www.uoh.edu.pk/jirs

JIRS, Vol.:5, Issue: 1, Jan – June 2020
DOI: 10.36476/JIRS.5:1.06.2020.12, PP: 101-114

علامہ اقبال: اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا مفکر شاعر

Allama Iqbal: A Thinker Poet of Islamic Renaissance

Dr. Saira Batool
Assistant Professor, International Islamic University, Islamabad

Dr. Sher Ali
Al Hamd Islamic University, Islamabad

Version of Record Online/Print: 29-06-2020
Accepted: 25-05-2020
Received: 31-01-2020

Abstract

The brief yet most precise introduction of Allama Muhammad Iqbal could be summarized in one sentence: "Iqbal is the thinker poet of Islamic Renaissance." His all concepts, thoughts, and ideology emanate from Islamic renaissance. It remains a fact that the rise and regaining by Muslims and the Islamic Ummah of their lost glory, dignity, and prosperity are directly linked with the Islamic renaissance. This very ideology is precisely and abundantly reflected in the thoughts, lectures, and poetic work of Allama Iqbal. The concept of "ego" is the most significant dimension of his thoughts, wherein he throws light on the characteristics of a true Muslim or Mo'min. On the other hand, Allama, through his concept of Islamic nationhood, expounds the ideology of an exemplary Islamic state. Therefore, in the context of the Sub-continent, his concept heralds the ideology of Pakistan. Within the perspective of Islamic renaissance in our modern age, if we delve deep into his work and thoughts, we conclude that his concept of renaissance truly represents the very Islamic renaissance. Allama Iqbal's exceptional farsightedness and intellectual eminence could well be gauged by the fact that not only did he espouse the core ideology of the Islamic renaissance but he also presented a clear and practical framework and roadmap to realize this cherished goal. This article discusses in detail the salient features of Allama's thoughts and ideology on the concept of Islamic renaissance in the present time.

Keywords: Iqbal, renaissance, Islamic renaissance, Islamic nationhood

CC BY

تمہید

مسلمانوں یا مسلم اُمہ کے دوبارہ عروج حاصل کرنے کے تصور کا تعلق دراصل اسلام کی نشاۃِ ثانیہ سے جڑا ہوا ہے۔یہی وہ تصور ہے جس کا مفہوم اقبال کے تصورات اور خطبات میں بھی پوشیدہ ہے۔ دورِ جدید میں اسلامی نشاۃِ ثانیہ کے سلسلے میں اقبال کے فکر و فن کا جائزہ لیں تو اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ نشاۃِ ثانیہ کا جو تصور اقبال نے پیش کیا ہے وہ اسلامی نشاۃ ثانیہ ہی کی ترجمانی کر رہا ہے۔انھوں نے اپنی فکر کے ذریعے نہ صرف مغربی نشاۃِ ثانیہ کا پول کھولا بلکہ خودی اور بے خودی کے تصورات کی بدولت مغرب کی ذہنی برتری کا پردہ بھی چاک کیا۔ان کی غیر معمولی بصیرت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں اور خطبات میں نہ صرف اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا مفہوم بیان کیا بلکہ اس کے منشور اور لائحہ عمل کی بھی نشاندہی کی۔

جدت:

زیر نظر مقالے میں فکر اقبال کے نمایاں پہلوؤں اور تصورات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اقبال کے ہاں موجود نشاۃِالثانیہ کے تصور اور اس کے منشور کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔

سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ:

قبل ازیں اس موضوع پر کچھ مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں اختصار کے ساتھ اسلامی تحریکوں کے پس منظر، فکر اقبال کے اثرات اور رجحانات کی نشاندہی کی گئی ہے۔اس کے علاوہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے " اقبال اور ملی نشاۃِ ثانیہ" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ بھی تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں اسی نوعیت کا کام وضاحت اور صراحت سے موجود ہے۔

منہج تحقیق:

زیر نظر مقالے میں عام روایت سے ہٹ کر مغربی اور اسلامی نشاۃِ ثانیہ کے فرق و امتیاز کو واضح کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مغربی نشاۃِ ثانیہ دراصل یورپ میں مادہ پرستی کر رجحان کا عروج ثابت ہوئی، جس نے دنیا جہان کو نہ صرف جنگ ہائے زرگری کی طرف دھکیلا بلکہ اقوام کو غلام بنانے کا بڑا سبب بن گئی۔ جب کہ فکر اقبال کی روشنی میں اسلامی نشاۃِ ثانیہ روح اور مادے ہر دو کے آمیزے سے تسخیر النفس و آفاق کی تحریک تھی جس نے مغرب کے مادہ پرست ذہن کو سختی سے رد کر دیا اور مادے کے ساتھ ساتھ روح کی اہمیت کو بھی واضح کیا۔اسی فکر کی بدولت بعد میں آنے والی اسلامی تحریکوں میں بلاامتیاز انسانیت کی فلاح و بہبود اور ہر قسم کی ذہنی و جسمانی غلامی سے آزادی کا جذبہ پیدا ہوا۔ جس کی آبیاری دراصل اقبال کے خودی اور بے خودی کے تصورات سے کی گئی۔

دنیائے اسلام میں کئی شخصیات محمد بن عبدالوہاب، جمال الدین افغانی، شاہ ولی اللہ اور دیگر اہم شخصیات نے احیائے اسلام یا نشاۃِ ثانیہ کی بھرپور تحریکوں سے اُمت مسلمہ پر اثرات مرتب کیے، مگر اپنی مربوط اور منضبط فکر اور پیغام کے لحاظ سے اقبال مثالی شخصیت کے طور پر اُبھرے بلکہ اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا عملی پہلو اسلامی تحریکوں میں فکر اقبال کے بعد نمایاں ہو کر سامنے آیا۔

اقبال کا مختصر ترین تعارف یہ ہے کہ وہ مسلم نشاۃِ ثانیہ کے مفکر شاعر ہیں۔ اقبال کے تمام بنیادی اور اہم موضوعات اسلامی نشاۃِ ثانیہ ہی سے متعلق ہیں۔ اِن میں سب سے نمایاں موضوع "خودی کا تصور" ہے۔ اقبال کا تصورِ خودی اور پھر تصورِ بے خودی، دونوں کو ایک ساتھ ، اسرار و رموز کہا جاتا ہے۔ اسرار و رموز ہی دراصل مسلم نشاۃِ ثانیہ کے اسرار و رموز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہربرٹ ریڈ نے ایک موقع پر کہا تھا:

آج جب کہ مقامی متشاعر اپنے بے تکلف احباب کے حلقے میں بیٹھے کیٹس کے تتبع میں کتے بلیوں اور ایسے ہی گھریلو موضوعات پر طبع آزمائی کر رہے ہیں تو ایسے میں لاہور میں ایک ایسی نظم تخلیق کی گئی ہے جس کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی نوجوان نسل میں طوفان بر پا کر دیا ہے اور ان میں سے ایک کے بقول:

"اقبال ہمارے لیے مسیحا بن کر آیا ہے اور اس نے مُردوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔"[1]

فکرِ اقبال کے نمایاں پہلوؤں میں تصورِ ملت اور اسلامی قومیت کے نظریات ہیں۔اقبال کی فکری کاوشیں برصغیر کی سطح پر تصورِ پاکستان کا پیکر اختیار کرتی ہیں تو عالمی سطح پر اقبال کے افکار اسلامی اتحاد کا پیش خیمہ ہیں۔ علاوہ ازیں اقبال کا تصورِ فن، تصورِ اجتہاد اور دوسرے تصورات در حقیقت اسلامی نشاۃ ثانیہ ہی کے مختلف پہلو ہیں۔اِن ہی موضوعات کا احاطہ اس مقالے کی بنیاد ہے۔

لفظ نشاۃِ ثانیہ کا مفہوم

نشاۃِ ثانیہ کا لفظ سامنے آتے ہی فوری طور پر ذہن اُس فرانسیسی اصطلاح کی طرف چلا جاتا ہے،جس کی ابتدا (RENAISSANCE کی تحریک کی صورت اٹلی سے ہوئی۔ ٹائن بی کی تحقیق کے مطابق:

"Renaissance کی اصطلاح انگریزی زبان میں پہلے پہل ۱۸۴۵ء میں رائج ہوئی۔ میتھیو آرنلڈ نے اسے فرانسیسی تلفظ کی بجائے انگریزی تلفظ اور انداز میں لکھنا شروع کیا۔"[2]

محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ پہلی بار فرانسیسی لفظ "RENAISSANCE" کا بطور اصطلاح اِن معنوں میں استعمال (یعنی گم شدہ قدیم خیالات کی از سرِ نو پیدائش یا دوبارہ پیدائش) اٹلی سے ہوا۔ یورپ میں اس خیال کو آگے بڑھانے والوں میں بوکاشیو، رینزو، گیاٹو اور برونی لیسکو کے نام اہم ہیں۔ قدیم اقدار کے احیاء کے ساتھ ساتھ اِس اصطلاح کا دائرہ بھی وسعت اختیار کرتا چلا گیا۔ ڈکشنری آف ہسٹوریکل ٹرمز کے مطابق:

"Today the term is used to refer not only to the revival in art, but to a total change in outlook which influenced science, economics and philosophy as well." [3]

مسلم نشاۃِ ثانیہ کا تعارف

اُردو لغت میں "Renaissance" کے معانی "نشاۃِ ثانیہ" لکھے ہیں۔ مترادفات میں "احیائے ثانیہ، حیاتِ نو، تجدید" وغیرہ دیئے گئے ہیں۔[4]

لغوی اعتبار سے "نشاۃِ ثانیہ" کی اصطلاح اگرچہ عربی الاصل ہے، تاہم بطور اصطلاح کے عربی زبان میں یہ اُس مفہوم میں مستعمل نہیں ہے۔ جیسا کہ اُردو زبان وادب میں ہے، "نشاۃ" کے لغوی معانی پیدائش یا احیاء کے ہیں اور "ثانیہ" کا مطلب "دوبارہ" کے ہیں۔ اس طرح دونوں الفاظ اپنے مرکب مفہوم میں "احیاء" یا "Renaissance" کے طور پر اُردو میں رائج ہو گئے ہیں، جب کہ عربی زبان وادب میں اس کی جگہ "نہضۃ" کی اصطلاح مستعمل ہے۔ گویا سادہ الفاظ میں جب ایک قوم عروج حاصل کرنے بعد زوال پذیر ہو جائے اور پھر اگر دوبارہ عروج حاصل کرلے تو اسے نشاۃِ ثانیہ کہتے ہیں۔اس کے لیے احیائے اسلام کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے جس سے مراد اسلامی اصولوں اور معیارات کے از سرِ نو پیدا ہونے کے ہیں، اس کا ایک پہلو تجدید بھی ہے جس سے مراد دین کو اُس حالت میں لوٹا دینا جس حالت میں وہ عہد نبوی ﷺ میں تھا۔ اُس عہد میں اسلام ہر لحاظ سے کامل مکمل اور خالص تھا۔

اُمت کا تصور قرآنِ کریم کی روشنی میں

قرآن مجید میں بنی نوع انساں کے لیے تین طرح کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ امُت ،ملّت ، قوم۔

اُمت : تمام انسان ۔ملّت : دین اور مذہب کی بنیاد پر۔ قوم : جغرافیے کی بنیاد پر عرب، عجم ،افغان وغیرہ۔

قرآن کی آیت ہے :

"کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً"

" تمام انسان ایک امت ہیں۔ "[5]

اسلام کا نصب العین حیات بھی ایک ہی ہےاور وہ نصب العین یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کی بنیاد احترام انسانیت پر رکھی جائے، ایک ایسا آزاد معاشرہ جس میں ہر قوم، ہر نسل ایک ہی مقصد کے لیے جہدِ حیات کرتی ہے، ایک ہی منزل کی طرف بڑھتی ہےاور وہ منزل ہے انسانی برتری۔جب بھی کوئی انسان دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے تو انفرادی امتیاز ختم ہو جاتا ہے، عربی، عجمی، مصری قوم کی انفرادیت ایک ہی مقصد حیات کے تحت اجتماعیت میں ضم ہو جاتا ہے۔

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ"[6] کے تصور نے وطن پرستی اور جغرافیائی حد بندیوں کے پرانے بتوں کو توڑ دیا۔

اسلام نے امتیازات کا خاتمہ کرکے انسانی نصب العین حیات کو بدل دیا، ہر قوم اور نسل کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا، نسلی امتیازات، طبقاتی درجہ بندی، معاشی اور معاشرتی اونچ نیچ کا خاتمہ کرکے لاالہ کی بنیاد پر معاشرتی مساوات پیدا کی۔

اسلامی تمدن کی روح، توحید اور رسالت

اسلامی تمدّن کی روح، توحید و رسالت ہے،اِن ہی دونوں پر اسلامی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر ہوئی ہے۔ توحید ماسوا اللہ کے ہر قوت کو سرنگوں کرتی اور انسان میں برتری کا احساس پیدا کرکے قوتِ حیات یعنی خودی کی پرورش کرتی ہے۔رسالت اس اجتماعی زندگی کی تکمیل کرتی ہے۔ زندگی ہر روز نئے مقاصد اور نئی آرزوؤں کے ساتھ آگے بڑھتی ہے، اسلامی طرز حیات میں توحید کے ساتھ ختمِ نبوت کا عقیدہ بھی ضروری ہے کیوں کہ ختمِ نبوت کا اسلامی عقیدہ ذہنی غلامی اور بے عملی کی نفسیات کو ختم کرتا اور زندگی کو قوت و عمل اور تخلیق و تعمیر کی راہ پر چلاتا ہے۔

مسلمانوں کا عروج

قوموں کا عروج وزوال قانونِ قدرت ہے، انسانی تاریخ اقوام و ملّل کے عروج زوال سے بھری ہوئی ہے۔یونانی تہذیب کی تباہی کے بعد روم اور رومی سلطنت کے انتشار کے بعد مسلمان، یہ تاریخی حقیقت ہے کہ کم و بیش ایک ہزار سال تک دنیا کی سیادت و قیادت مسلمانوں کے پاس رہی۔ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی تک مسلمان دنیا کی قیادت و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی تک براعظم افریقہ، وسط ایشیا اور ہندوستان کے علاقے مسلمانوں کے زیرِ نگیں آگئے۔ تُرکوں کی عظیم سلطنتِ عثمانیہ کی بنیاد تیرھویں صدی عیسوی میں رکھی گئی، پندرھویں صدی عیسوی تک ترکی سے ملحقہ یورپی علاقے سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ بنتے چلے گئے، سلطان محمد فاتح نے ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو قسطنطنیہ فتح کیا،اس تاریخی شہر کی فتح پوری اسلامی تاریخ کا یادگار واقعہ ہے، اس فتح سے آپ ﷺ کی وہ پیش گوئی پوری ہو گئی کہ ' خدا نے مجھے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کی کنجیاں دے دی ہیں۔

مغربی مورخین قسطنطنیہ کی فتح کو قرونِ وسطیٰ اور دورِ حاضر کے درمیان حدِ فاصل قرار دیتے ہیں اور یہ ہے بھی حقیقت

قدیم بازنطینی سلطنت کے پایۂ تخت اور پوری عیسائی دنیا کے روحانی مرکز کی تسخیر، جہالت کے اندھیروں میں ڈوبے اہلِ مغرب کی ناقابلِ فراموش شکست تھی۔

فتحِ قسطنطنیہ کے بعد ۱۵۱۶ء میں مصر و شام بھی سلطنتِ عثمانیہ میں شامل ہو گیے، ایران میں صفوی خاندان کی حکومت قائم ہوئی، ۱۵۲۶ء میں مغلوں نے ہندوستان پر اپنی عظیم الشان حکومت کی بنیاد رکھی۔ اس طرح اِن تین حکمران خاندانوں کے اقتدار کے ساتھ دنیائے اسلام اپنی تاریخ کے نئے دور میں داخل ہوا۔

سلطنتِ عثمانیہ سولھویں صدی تک عالمی طاقت کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھری۔ سترھویں صدی کے وسط تک سلطنتِ عثمانیہ کی حدیں ایک طرف دریائے ڈینیوب سے خلیج فارس تک اور دوسری طرف وسطِ ایشیا کے یوکرینی علاقے سے طرابلس اور الجزائر تک پھیل چکی تھیں۔ اس کے علاوہ بحیرۂ روم، بحرِ احمر، بحرِ ابیض اور بحرِ ہند (کے کچھ حصوں) میں واقع تجارتی شاہراہوں پر بھی اس کا مکمل کنٹرول تھا۔[7]

مولانا غلام رسول مہر اپنی کتاب "مختصر تاریخ اسلام" میں لکھتے ہیں:

"ترکی کی سلطنت مسلمانوں کی آخری سب سے بڑی سلطنت تھی۔ بحری و بری قوت، مال و دولت، جاہ و جلال اور عظمت و ہیبت میں اس جیسی سلطنتیں دنیا میں بہت کم ہوئی ہیں۔ ترک چھ سو برس تک یورپ کے مقابلے میں نہ صرف اسلام بلکہ پورے ایشیا کی حفاظتی ڈھال بنے رہے۔"[8]

مسلمانوں کا زوال

دوسری طرف نشاۃ ثانیہ نے مغربی دنیا میں ایک نئی روح پھونک دی، سمندروں میں نئے راستے دریافت ہوئے، اہم جغرافیائی انکشافات ہوئے، یورپی ممالک میں استعماری مملکتوں کی داغ بیل پڑی۔ تاہم ترکوں کے استحکام اور طاقت سے مغربی اقوام خائف تھیں لیکن ۱۶۸۳ میں وی آنا کی تسخیر میں ناکامی، نا صرف سلطنت عثمانیہ کے زوال کا نقطعہ آغاز بنی بلکہ اس سے یورپ میں ترکی کا سیاسی اثر ورسوخ بری طرح متاثر ہوا۔ اسلامی اقتدار کے خلاف مغرب کا ردعمل شدّت اختیار کر گیا اگرچہ اس ردعمل میں استعماری رجحانات کا آغاز تو پندرھویں صدی کے آخری چند سالوں میں پرتگالی واسکوڈے گاماکے "راس اُمید" کی طرف سے ہندوستان جانے کا راستہ دریافت کرنے اور کولمبس کے "نئی دنیا" تک پہنچنے سے ہو گیا تھا مگر نتیجے نے ترکی کو یورپ کا "مردِ بیمار" بنا دیا۔

دوسری جنگِ عظیم میں ترکوں نے قدیم روس دشمنی کی وجہ سے جرمنی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تو اتحادیوں (برطانیہ، فرانس، روس) نے اکتوبر ۱۹۱۴ء میں ترکی کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا، انگریز کرنل لارنس المعروف لارنس آف عریبیا کو عربوں اور ترکوں میں افتراق پیدا کرنے کے لئے عرب بھیجا گیا جس کے نتیجے میں مکہ کے گورنر (شریف) شاہ حسین نے ۱۰ جون ۱۹۱۶ء کو ترکوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا، اسی دوران سب سے بڑا حادثہ یہ ہوا کہ بیت المقدس (یروشلم) جسے ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے فتح کیا تھا ۷۳۰ سال بعد عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس طرح سلطنتِ عثمانیہ کا شیرازہ بکھر گیا۔

اسلامی ملک ایران سے ملحقہ روس کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ ایرن کی طرف اپنی سرحدوں کی توسیع کر کے خلیج فارس کے گرم پانیوں تک رسائی حاصل کرے، مگر برطانیہ نے اپنے مفادات کے تحت اُس کی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے

دیا۔ انیسویں صدی سے ایران، روس اور برطانیہ کے دباؤ اور سازشوں کا شکار رہا۔

بر صغیر پر مغلیہ سلطنت ۱۵۲۶ء میں قائم ہوئی۔ اس شاندار سلطنت کا زوال ۱۷۰۷ء میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات سے شروع ہوا، عالمگیر کے بیٹوں کی اقتدارِ ہوس نے تاجروں کے بھیس میں موجود انگریزوں کو موقع دیا کہ وہ اپنے مفادات کے تحت انتشار کو ہوا دے کر مملکت کو کمزور کریں، اس کے ساتھ ساتھ نادر شاہ کے حملے، سراج الدولہ کی جنگ پلاسی اور سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی میسور کے میدان میں شہادت وہ اسباب تھے جنھوں نے بدیسی حکمرانوں کی راہِ اقتدار آسان کی، جس کے نتیجے میں کمپنی بہادر کے مقابلے میں آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو شکست ہوئی اور یوں ۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کے طویل دورِ حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ہندوستان برطانیہ کی نوآبادیات بن گیا۔

مغربی استعمار کے سبب نا صرف ہندوستانی مسلمانوں کی حاکمیت کا خاتمہ ہوا بلکہ انھیں ایسی صورتحال سے سابقہ پڑا جو سلطنتِ عثمانیہ اور ایران کے مسلمانوں سے حد درجہ مختلف تھی۔ ناکام جنگِ آزادی کے بعد وہ انگریز حکمرانوں کے انتقام کا خصوصی نشانہ بنے، انھیں ہر ہر میدان میں ہندوؤں کے مقابلے میں نظر انداز کیا گیا اور وہ ایک عرصے تک موثر اقلیت بھی نہ بن سکے۔ اسی دوران ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس قائم ہوئی، جس کی بنیادوں میں مسلم تعصب موجود تھا۔

سترھویں صدی مسلمانوں کے عروج کی آخری صدی تھی اور بیسویں صدی کے آغاز تک اُمت مسلمہ کی کوئی قابلِ ذکر ریاست ایسی نہ رہی تھی جہاں مسلمانوں کی حاکمیت، بالادستی یا کُلی اختیار ہو۔

استعماری تسلط کے خلاف مزاحمت

نوآبادیاتی تسلط، دوسری اقوام کی بالادستی، اور استحصالی نظام نے مسلمانوں کے ہاں مزاحمت پیدا کر دی، نظریاتی اور تہذیبی پہچان کی از سر نو دریافت کا شعور بیدار ہوا، استعمار کی فکری اور تہذیبی یلغار نے اس احساس کو پختہ کیا کہ وہ قابل فخر دینی و تہذیبی اقدار اور علمی ورثے کے امین ہیں۔

اقبال کی فکر کا محور

یہ تھا عالم اسلام کا سیاسی، تاریخی اور تہذیبی منظر نامہ جب انیسویں صدی کے آخر علامہ محمد اقبال کی پیدائش ہوئی۔ اقبال کے فکری شعور کے ارتقاء میں کئی عوامل نے کردار ادا کیا، انتہائی مذہبی گھرانے میں اُن کی پرورش ہوئی، والدین صوم و صلوۃ کے پابند، سادہ مزاج تھے، والد نور محمد عبادت گزار، خدا ترس، پرہیزگار اور صوفی منش انسان تھے۔ اقبال نے اُن کی اسلام سے محبت اور خدا ترسی کے کئی واقعات بیان کیے ہیں، اس واقعے کو تو کہ 'قرآن کو ایسے پڑھا کرو جیسے اُس کا نزول تمھارے دل پر ہو رہا ہو اقبال نے شعر میں بھی بیان کیا ہے:

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف[9]

شیخ نور محمد عجمی تصوف کے قائل اور سلسلہ قادریہ سے بیعت تھے جس کے ابتدائی اثرات اقبال نے بھی قبول کیے۔ اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار عربی، فارسی کے اُستاد سید میر حسن کا ہے۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

"میر حسن شاہ نے جب اقبال کو گلستان، بوستان، سکندر نامہ، انوارِ سہیلی اور ظہوری کی تصانیف پڑھائیں تو رسمی اندازِ تدریس سے قطع نظر کر کے یہ کوشش کی کہ اقبال کے دل میں فارسی ادب کا احترام پیدا ہو جائے اور نتیجتاً اس

ذوقِ سلیم کی تربیت ہو جس کے بغیر مطالعہ بالکل بیکار اور بے ثمر ہو جاتا ہے۔"[10]

مولوی میر حسن ادبیات، لسانیات، ریاضیات اور تفسیر قرآن کے ماہر تھے، فارسی اور اُردو کے اشعار زبان پر رہتے تھے انہی کے ذوقِ اثر سے اقبال کو بچپن ہی میں فارسی کے سینکڑوں شعر یاد ہو گئے تھے، انھوں نے اقبال کو عربی، فارسی، اُردو کے علاوہ علم و حکمت اور تصوف سے روشناس کرایا اور اسلامیات سے ایسی رغبت پیدا کر دی کہ ساری زندگی اس کی محبت میں سرشار رہے۔ دوسری منزل مغربی ادب اور فلسفہ علم کی تحصیل تھی، فلسفے کی تعلیم اقبال نے پروفیسر آرنلڈ سے حاصل کی، اس عالم اُستاد نے اقبال کے ذہن کو جلا بخشی اور ان میں فلسفے کا ذوق پیدا کر دیا۔

اس کے علاوہ انجمن حمایت اسلام، شیخ عبدالقادر سے دوستی، رسالہ مخزن سے وابستگی، اس کے اثر سے رومانوی اثرات، مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں کیمبرج اور میونخ سے ڈگری کا حصول، یورپی علوم خصوصاً فلسفے اور ادب کا مطالعہ، ہیگل اور مارکس کا عینی اور مادی جدلیاتی ارتقاء، نطشے کی لبرل، بورژوا سوسائیٹی اور اس کی اقدار کی، تحقیر اور مافوق البشر کا پیغام، برگساں کا تصور زمان اور اثباتِ وجدان، کانٹ کی انسانی عقل کی تنقید اور تجدید غرض ان سب کا مطالعہ، اس کے ساتھ ساتھ ان طاقتوں کا بھی مشاہدہ جو ایک طرف علم کے زور پر تسخیر کائنات کرکے انسان کے سامنے لامتناہی در وا کر رہی تھیں اور دوسری طرف تمام دنیا کو مادی اور روحانی استحصال کے جال میں گرفتار کر رہی تھیں اور خود زندگی کے روحانی سرچشموں کو خشک کرکے انسانوں کو مشینوں میں تبدیل کرتی جارہی تھیں۔

اقبال اپنے نظام فکر میں لاتعداد ماخذات سے فیض یاب ہوئے، اُنھوں نے اپنی فکر کی بنیاد اسلام کے عقائد اور حکمائے اسلام کی عظمت پر رکھی، اپنی تحریروں میں اُنھوں نے ان ماخذات کے حوالے دیئے ہیں جن سے ان کے ذہن نے اثرات قبول کیے، ان علمائے اسلام، ان کے افکار اور ان تحریکات کی نشاندہی کی جن سے ان کی فکر کی آبیاری ہوئی۔

یہی وجہ ہے کہ ستمبر ۱۹۰۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے تین سال کی چھٹی لے کر یورپ جانے والا اقبال جولائی ۱۹۰۸ میں وطن واپس کے سفر میں علمی اور فکری مطالعے کی بلندیوں پر تھا۔

قوموں اور تہذیبوں کو اپنی بقا اور پہچان کے لیے تنظیم سازی بھی کرنی پڑتی ہے اور بالا دست اقوام کی توسیع پسندی، زورِطاقت اور دوسری اقوام کو مغلوب کرنے کے استعماری عزائم بھی لوگوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی بقا کے لیے نشاۃِ ثانیہ کی تحریکیں منظّم کریں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بھی تحریکیں وجود میں آتی رہیں، جن میں وہابی تحریک، شاہ ولی اللہ کی تحریک، علی گڑھ تحریک، سید جمال الدین افغانی کی تحریک، تحریک اتحاد اسلامی وغیرہ اہم ہیں۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل اپنی کتاب "اقبال اور جدید دنیائے اسلام" میں لکھتے ہیں:

"اقبال اپنی فکر اور اپنے پیغام کے لحاظ سے، بیسویں صدی کی دنیائے اسلام کی سب سے اہم اور مؤثر شخصیت ہیں۔ جدید دنیائے اسلام جن داخلی افکار و نظریات اور تحریکوں سے متاثر ہوتی رہی ہے، اُن میں محمد بن عبدالوہاب، سید جمال الدین افغانی۔۔۔ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ اور سید احمد خان، ترکی میں مدحت پاشا اور فواد پاشا، ایران میں شیخ ہادی نجم آبادی، تیونس میں خیر الدین پاشا، الجیریا میں امیر عبدالقادر اور مصر میں مصطفٰے کامل جیسے مصلحین اور مفکرین ہیں۔ جنھوں نے ذہنی اور سیاسی بیداری کی ایک فضا پیدا کر دی۔۔۔ لیکن اپنے مربوط و منضبط فکر اور پیغام کے لحاظ سے اقبال ان سب سے مختلف ہیں، ایک بڑا امتیاز تو اقبال کا یہی ہے کہ اُن کی فکر کے اثرات نہ صرف

برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں پر بہت واضح ہیں ، بلکہ دنیائے اسلام کے دیگر ممالک میں اور وہاں کے افکار و تحریکات پر بھی اُن کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ "[11]

اقبال کا تصورِ انسان (خودی)

اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا منبع و مرکز قرآن و حدیث ہے۔اقبال نے حیات انسانی کا مربوط اور متوازن تصور پیش کیا جس کی بنیاد حقیقی اسلامی تصورات پر قائم کی۔انھوں نے انسانی تشخص کی بیداری کے ساتھ ساتھ مسلم مذہبی قومیت کے تصور کو فروغ دیا اور اُن کا سب سے بڑا کارنامہ جدید سائنسی اور فلسفیانہ نظریات کی روشنی میں اسلامی الٰہیات کی تشکیل نو ہے۔اسی وجہ سے انھوں نے اپنے انگریزی خطبات پر مشتمل کتاب کا نام (Reconstruction of Religious Thought in Islam) یعنی اسلام میں دینی فکر یا مذہبی تفکر کی تشکیل جدید رکھا، جس کا اردو ترجمہ نذیر نیازی نے " تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ " کیا۔اس کتاب میں اقبال نے پہلا نظام الٰہیات پیش کیا جو خالصتاً قرآنِ پاک کے مطالعے پر مبنی ہے۔

احیائے اسلام کے لیے ایک ضروری نکتہ تصورِ انسان بھی ہے۔علامہ اقبال نے قرآنِ پاک کے تصورِ انسان کو بیان کیا اور قرآنِ پاک کے تصورِ انسان سے تصور خودی اخذ کیا۔علامہ کے افکار اور تصورات کا سرچشمہ اسرارِ خودی کو کہا جاتا ہے، انھوں نے اپنے پیغام یا فلسفہ حیات کو اسی نام سے موسوم کیا ہے، خودی فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے دو معانی ہیں ایک تو خود کا شعور اور دوسرا خود کا حد سے بڑھا ہوا احساس یعنی غرور، انا، تکبر، خود غرضی اسے شیطانی انانیت خودی بھی کہہ سکتے ہیں اسی غرور و تکبر کے سبب شیطان نے اپنی اور آدم کی تخلیق میں امتیاز کرتے ہوئے سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا۔

پہلی خودی "مَنْ عَرَفَ نَفْسَه فَقَدْ عَرَفَ رَبَّه" "جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا" کے مصداق ہے اس خودی کی معرفت خصائص رذیلہ سے محفوظ رکھتی ہے اور عارفِ خودی کو فرائضِ زندگی سے آگاہ کرکے اس کو بندۂ خدا بنا کر "خليفة الله في الأرض" کا اہل ٹھہراتی ہے۔علامہ اقبال نے خودی کا لفظ اسی معنی میں کیا ہے غرور و تکبر نہیں بلکہ احساس نفس یا تعین ذات۔ انسان کا اخلاقی اور مذہبی نصب العین نفی خودی نہیں بلکہ اثباتِ خودی ہے۔انا بمعنی انفرادیت و یکتائی، آپ ﷺ کی حدیث ہے "اپنے اندر اوصاف خداوندی پیدا کرو" اور اثباتِ خودی سے ہی انسان فرد یکتا بنتا ہے۔ تب ہی اُسے اُس ذاتِ یکتا کا قُرب حاصل ہوتا ہے۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خُدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے فقط جوہر خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا[12]

گویا خودی سے مراد خود آگاہی ، شعور ذات ،خودی ایمان و عشق کے مترادف۔۔ اُن سوالات کے جوابات تلاش کیے ہیں۔انسان ، کائنات ،کائنات میں انسان کا وجود۔۔۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداری کائنات[13]

اقبال کا بے خُودی (اُمت) کا تصور

رموزِ بے خودی، یہ مثنوی اسرار خودی کے تسلسل میں لکھی گئی۔ یہاں بھی بے خودی سے مُراد ظاہری معنوں میں خود میں گم ہو جانے یا ہوش وحواس سے بیگانہ ہو جانے کے نہیں بلکہ یہ وہ بے خودی ہے جو خودداری اور خود شناسی سے پیدا ہوتی ہے، قطرے کا بحرِ بیکراں سے مل جانے کا عمل ہے، فرد کا انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت میں گم ہو جانے کا سبق ہے، ذاتی مفاد سے بلند ہو کر قوم کی فلاح و بہبود کے لئے کوشش کرنا، فرد کا ملت سے ربط۔ ملت اسلامیہ کی مساوات کا پیغام ہے۔ گویا اسرارِ خودی میں اقبال نے انسان کی انفرادی شخصیت کی نشو ونما کے اصول و ضوابط سکھائے ہیں اور رموزِ بے خودی میں حیاتِ اجتماعی کے اصول بتائے ہیں۔

اسلام کا احیاء یا نشاۃ ثانیہ کا تصور علامہ اقبال کے خطبات میں جگہ جگہ بکھرا ہوا ہے، چوتھے خطبے میں اقبال نے تصور خودی کو بیان کرتے ہوئے ان سوالات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ انسانی نفس، روح یا انا کیا چیز ہے۔ وہ کن اوصاف سے متصف ہے؟ کیا وہ جسم سے الگ کوئی شخصیت رکھتی ہے کہ نہیں؟ کیا وہ ذی اختیار اور اپنی سوچ اور عمل میں آزاد ہے؟ اور کیا موت کے بعد اُسے بقا نصیب ہے؟

"وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا"[14]

"اور انسان کہتا ہے جب میں مر جاؤں گا تو کیا پھر زندہ کرکے نکالا جاؤں گا۔"

اقبال کے نزدیک اسلام کا احیاء مذکورہ بالا سوالات کو طے کیے بغیر نہیں ہو سکتا۔ انسان کی اصل روحانی ہے یا مادی، انسان کا خدا کی توحید پر یقین انسان کی اصل کو روحانی بنا دیتا ہے اس طرح اقبال طے کرتے ہیں کہ انسان کی اصل روحانی ہے۔ یہ سوال کہ کیا انسان ذی اختیار اور اپنی سوچ اور عمل میں آزاد ہے، دراصل قرآن پاک کے اس تصور سے اخذ ہوتا ہے کہ قرآن پاک انسان کو مجبور نہیں بلکہ سوچ اور عمل میں آزادی مہیا کرتا ہے

"قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَى شَاكِلَتِهِ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَى سَبِيلاً"[15]

"کہہ دو کہ ہر شخص اپنے طریقہ پر کام کرتا ہے پھر تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ سب سے زیادہ ٹھیک راہ پر کون ہے۔"

اقبال خودی کے بارے میں اپنے نظریات اس لئے پیش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال میں غیر اسلامی تصور انسان نے زہر قاتل کا کردار ادا کیا، اُنھوں نے انتہائی ضروری سمجھا کہ نشاۃِ ثانیہ کے لئے صحیح اسلامی تصور انسان کو قائم کرنا ہوگا۔ اس تصور انسان کے مطابق خودی اگرچہ تضاد کا شکار ہوتی ہے لیکن ہمیں اُن امکانات کو ملحوظ رکھنا ہوگا جو خودی کی زد میں ہیں اور جہاں پہنچ کر خودی ایسی مستحکم اور قوی ہو جاتی ہے کہ کوئی ہیجان اُس کی وحدت کو درہم برہم نہیں کر سکتا اقبال کے نزدیک خودی کی پہلی صفت یہ ہے کہ خودی کا اظہار اُس وحدت میں ہوتا ہے جسے ہم کیفیات نفسی کی وحدت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ([16])

خودی کی دوسری خصوصیت اُس کی مخصوص خلوت ہے جس کی بدولت خودی کی اپنی ایک یکتا حیثیت ہے اس ضمن میں اقبال کہتے ہیں:

"میری خوشی، میری تکلیف اور اسی طرح میرا احساسِ ندامت، میری افسردگی اور میرا احساس جوش و خروش، یہ سب احساساتِ حظ و قرب میرے احساسات ہی ہوں گے کسی دوسرے کے نہیں ہو سکتے اور یہی میری خودی کی

خلوت و یکتائی کا ثبوت ہے۔ "[17]

اقبال اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ کیا خودی اپنی فعالیت آپ متعین کرتی ہے، یہ سوال خودی کی آزادی کا سوال ہے۔ اقبال قرآنِ پاک کی آیت کا حوالہ دیتے ہیں:

"وَ قُلِ الحَقُّ مِن رَبِّکُم فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُر"[18]

"اور کہہ دیجیے، حق تو وہی ہے، جو تمہارے رب کی طرف سے ہے، پس جو چاہے، ایمان لائے اور جو چاہے انکار کرے۔"

اقبال انسان کو اپنی سوچ اور اعمال کا خود ذمے دار قرار دیتے ہیں، اسی آزادی کی بنا پر انسان سے روزِ محشر سوال وجواب کیا جائے گا، اگر آزادیِ اعمال نہیں تو سوال وجواب بھی نہیں۔

علامہ اقبال کا خیال یہ ہے کہ خودی صرف داخلی احساسات تک محدود نہیں ہے یہ خارج سے بہت ہی بے مثال طریقے سے منسلک اور پیوست ہے یہ خودی کی خارج میں شمولیت ہے اور اسے اقبال بے خودی کا نام دیتے ہیں۔ خودی اپنے اندر مضبوط ہو کر انجمن، محفل، ملت، قوم اور ملتِ اسلامیہ کے لیے خود کو وقف کر دینے کا نام ہے۔ یوں خودی داخلی نراجیت سے بچ جاتی ہے اور اپنی صلاحیتوں کو ملّت اور قوم کے لیے قابل استعمال بنا دیتی ہے یوں خودی کا اپنا وجود بھی باقی رہتا ہے اور قوم بھی مضبوط ہو جاتی ہے۔ علامہ کا تصور ملت وہ تصور ہے جسے اسلامی قومیت کا نظریہ کہتے ہیں اسی قومیت کے نظریے کے تحت اقبال نے تصور پاکستان پیش کیا جہاں مسلمانانِ برصغیر نے اپنے اسلامی اصولوں کے مطابق معاشرے کو قائم کرنا تھا۔

اقبال کے نزدیک اسلامی نشاۃِ ثانیہ کے کچھ مراحل اور پہلو ہیں۔ پہلا مرحلہ فرد کی مضبوطی اور قوت کا حصول ہے جو فقط اور فقط اسلامی اصولوں اور اخلاقیات سے کسب بتایا، اس کا اظہار علامہ نے "اسرار خودی" میں کیا ہے۔ دوسرا مرحلہ فرد کا قومیت کے اجتماعی مقاصد میں خود کو ضم کر دینا ہے یوں فرد ملت کا کارآمد عضو اور عنصر بن جاتا ہے۔ نشاۃِ ثانیہ کا تیسرا مرحلہ اُس کا سیاسی پہلو ہے جس کے مطابق مسلم فرد اور مسلم قوم ایک ریاست کی بنیاد رکھ کے اپنے اعتقادات کے پرکھنے کے لیے سیاسی طاقت حاصل کرتے ہیں اقبال طاقت کے حصول کے بغیر مسلمانوں کی قومی زندگی کو نامکمل سمجھتے ہیں۔ اُنھوں نے بیسویں صدی میں ایک ایسے معاشرے کا تصور پیش کیا جس کی اساس رنگ، نسل اور علاقے کی بجائے نظریہ و ایمان پر ہو، خودی اور بے خودی کا حسین امتزاج ہو، اس معاشرے کی پشت پر ایک مصلح ریاست ہو، جو طاقت اور قوت میں ایک غالب حیثیت کی حامل ہو گی۔ بقول اقبال:

عصانہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

تصورِ ریاست پر خطبہ الہٰ آباد میں تفصیلی بحث پیش کی۔

اقبال کے نزدیک مسلم معاشرے کی نشاۃِ ثانیہ اور ایک بالادست معاشرے کا خواب اُس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، جب تک قرآن وسنت کی روشنی میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو نہیں ہو جاتی، اُن کے خیال میں اس راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ملوکیت، ملائیت اور تصوف ہیں۔

"فن" و "اجتہاد": نشاۃِ ثانیہ کا ذریعہ

اقبال کے مطابق فن اور آرٹ کو قومی زندگی کی مضبوطی بقا اور ترقی کا ذریعہ و ضامن ہونا چاہیے اقبال خود کو شاعر کہنے کے بجائے "سوئے قطار می کشم، ناقۂ بے زمام را" کا مطلب اور مقصد اپنی شاعری کو قرار دیتے ہیں۔ وہ ادب کو حظ یا جمالیاتی سکون کی

بجائے پُر مقصد ہونے پر زور دیتے ہیں۔ اقبال آرٹ کے تمام مظاہر کو مسلمان قوم کی بیداری اور ترقی اور عظمت کے حصول کے لیے معاون قرار دیتے ہیں اُن کے ہاں آرٹ برائے آرٹ کی کوئی گنجائش نہیں ہے وہ کہتے ہیں :

جہانِ تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود

کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا[19]

یہاں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ اسلامی نشاۃِ ثانیہ اقبال کے لئے ایک ضروری مقصد اور منزل رہا تو اس کے حصول کے لیے اقبال کون سا طریقہ اور راستہ وضع کرتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی اصولوں کو مٹا کر نئے حالات کے مطابق پوری طرح تبدیل ہو جانا اسلامی نشاۃِ ثانیہ نہیں ہے۔ اقبال نشاۃِ ثانیہ کے حصول کے لئے اجتہاد کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اسلامی عقائد اور معاشرت کے کچھ عناصر ابدی اور غیر متبدل ہیں اور کچھ وقت کے ساتھ بدلنے والے اور تغیر پذیر ہیں۔ اسلام کے احیاء کے لیے یہ سوال بہت اہم ہے کہ ابدی اصولوں اور متغیر حالات کے درمیان کس طرح کا تعلق ہونا چاہیے۔ اسلام کی بقا اور دوام کے لئے یہ شرطِ اول ہے کہ مستقل اقدار کی مسلسل حفاظت کی جائے اور بدلنے والے پہلوؤں میں حالات اور ضرورت کے مطابق تبدیلی لائی جائے۔ اسلام اور نبی پاک ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں ثبات اور تغیر دونوں رُخ موجود ہیں علامہ کا اجتہاد کا تصور ان دونوں عناصر کے درمیان مطابقت اور توافق قائم کرنے سے عبارت ہے۔ اجتہاد کے عمل میں نئے حالات اور نئی ضروریات میں کتاب و سنت کی روح کی مطابقت میں قانون سازی کرنا اور اجتماعی تنظیم کے نئے ضوابط مقرر کرنا اجتہاد ہے تاکہ زمانے اور ماحول کے اختلاف کے باوجود اسلام کے بنیادی تقاضے پورے ہوتے رہیں اور زندگی کے نظم وضبط اور ترقی اور ارتقاء میں خلل واقع نہ ہو۔ اقبال اسلام کے ابدی اصولوں کی قیمت پر اجتہاد پر بالکل راضی نہیں ہیں وہ ابدی اصولوں کو سلامت رکھتے ہوئے نئے اصولوں کو وضع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور یوں وہ اجتہاد کو اسلامی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ضروری اور اہم قرار دیتے ہیں۔

قیام یورپ کے دوران اقبال کے فکری انقلابات ہی دراصل ہندوستان میں مسلم نشاۃِ ثانیہ کا حقیقی باعث بنے۔ اس سے قبل شاہ ولی اللہ اور دیگر اولیا کی مساعی اگرچہ قابل داد ہیں مگر وہ ایک تحریک کا درجہ حاصل نہیں کر سکیں۔ فکر اقبال سے ایک باقاعدہ تحریک کا آغاز ہوتا ہے جو اسلامیان ہند کی آزادی پر منتج ہوتا ہے اور دیگر اسلامی ممالک کے لیے بھی ایک تحریک کا باعث بنتا ہے۔

اقبال نے یورپ میں قیام کے دوران اگرچہ اسلامیان ہند کی رہنمائی کا ارادہ کیا تھا مگر ان کا یہ پیغام تمام اسلامی ممالک کے لیے تھا۔ اُن کی فکر کی روشنی جہاں ترکی، ایران اور افغانستان جیسے اہم ممالک میں پہنچی اور وہاں کے مفکرین کو متاثر اور متحرک کیا وہیں انھوں نے عملی طور پر بھی جہاں تک ممکن ہو سکا عالم اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے اقدام کیے۔ گول میز کانفرنس کے بعد ان کا فلسطین کا دورہ اور موتمر کے اجلاس میں شرکت کے دوران عالم اسلام کے لیے اتحاد و تنظیم اور آزادی کا پیغام دینا، ترکی کے مسائل کے سلسلے میں عملی طور پر ہندوستان میں رونما ہونے والی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا، بلقانی جنگوں اور نسل پرستی کے خلاف آواز اٹھانا، افغانستان میں تعلیمی اصلاحات کے لیے سفر کرنا وغیرہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔ وہ عالم اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے اس قدر خواہاں تھے کہ جہاں کہیں بھی مسلمانوں کے خلاف استعمار کی جارجیت دیکھتے قلمی یا عملی طور پر آواز بلند کرتے جو یورپ کے ایوانوں میں کھلبلی مچا دیتی۔ مسولینی کا ابی سینیا پر حملہ ہو یا روس کی ایران پر حریصانہ نظر کوئی معاملہ ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھا۔ اسی لیے اہل یورپ نے ان پر پین اسلام ازم کے حامی ہونے کا الزام بھی لگایا جس کی انھیں خود تردید کرنی پڑی۔

حاصلِ بحث

اقبال کے خطبات کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ وہ مسلم نشاۃِ ثانیہ کو جدیدیت کی ایک تحریک کے طور پر دیکھ رہے تھے۔وہ رجعت پسندانہ طور پر نہیں بلکہ مسلم نشاۃ الثانیہ کی بنیاد سائنسی بنیادوں پر دیکھ رہے تھے اور سائنس اور اسلامی تعلیمات کی ہم آہنگی سے ایک عالم گیر اور جدید ثقافت کو ابھرتا محسوس کر رہے تھے جو کہ دراصل اسلامی ثقافت کا خاصہ ہے اور جس کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے انھوں نے ایک فلسفیانہ خطبہ "ثقافت اسلامی کی روح" بھی ارشاد فرمایا۔اسی طرح اجتہاد کے بارے میں ان کے تصورات ان کے فلسفیانہ خطبے "الاجتہاد فی الاسلام" میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ترکی کا ترقی پسند شاعر محمد عاکف ہو یا ایران کا مذہبی فلاسفر علی شریعتی سب ان کی فکر سے متاثر نظر آتے ہیں۔ہم مختصر الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ اقبال دنیا میں وہ واحد مسلم رہنما تھے جن کی فکر نے تمام عالم اسلام کو متاثر کیا اور مسلم نشاۃ الثانیہ کی ترویج و تحریک کا حقیقی باعث بنے۔

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہوتا ہے کہ نشاۃِ ثانیہ کا مفہوم مسلمانوں اور مغرب والوں کے درمیان کتنا مختلف اور جدا رہا ہے۔یورپی نشاۃِ ثانیہ یعنی "Renaissance" کا بنیادی سروکار انسان،انسان کی ترقی، عقلی اصول اور ہیومنیزم ہے۔اس مضمون میں تفصیل سے یہ دیکھا گیا ہے کہ مغربی نشاۃ الثانیہ ایک بڑی ذہنی فکری تحریک تھی جس کے ثمرات سے مغرب نے خوب فائدہ اٹھایا اور وہ ترقی کی ایک خاص نمایاں نہج تک پہنچ گئے۔اس دوران حالات بدلتے رہے مغربی تحریکوں کے علاوہ عالم اسلام مصر،ترکی ،مشرق وسطی اور برصغیر کے خطے مختلف قسم کی سیاسی فکری کشاکش اور سرگرمی میں زندہ رہے۔ان بدلتے حالات کی وجہ سے مسلمانوں میں کئی مجددانہ تحریکیں چلیں اور کئی مصلح قوم اور فکری رہنما پیدا ہوئے۔ان سب حالات کی موجودگی میں اقبال منصۂ شہود پر آتے ہیں اور وہ برصغیر کے مستقبل کو دو قومی نظریے کے ذریعے طے کرتے ہیں۔برصغیر کے مسلمانوں کو تصور پاکستان کی شکل میں ایک واضح منزل نظر آنا شروع ہوتی ہے۔اس منزل کی نشان دہی کرنے والوں میں علامہ اقبال اور قائداعظم نے واضح رول ادا کیا۔اقبال نے اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے مسلمانوں کو غلامی سے آزاد کروانے کے لیے ریاستی طاقت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی طرف راغب کیا۔اقبال نے مسلم قوم کی بیداری کے لیے زوال کے اسباب بیان کیے۔بیماری کی تشخیص کی اور علاج تجویز کیا۔اقبال کو پورا یقین تھا کہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ صرف اور صرف اندھی تقدیر پرستی کو چھوڑ کر،انسان کو اللہ تعالی کی طرف سے ودیعت کی گئی عمل و سوچ کی آزادی کے ذریعے ہی حالات تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔مسلمانوں کے دوبارہ عروج حاصل کرنے کے سوال کا جواب علامہ اقبال ایک نئے تصور انسان سے وابستہ کرتے ہیں۔یہ نیا انسان اقبال کے تصور خودی میں موجود ہے۔ہم نے دیکھا کہ اقبال نے تصور خودی میں سب سے اہم بات یہ کی ہے کہ انسانی خودی سپر ایگو سے صادر ہوتی ہے اور انسانی خودی خدا تعالی سے تعلق میں موجود رہ کر اس کائنات پر ایسا تصرف قائم کر سکتی ہے جب خودی خدائی نور سے منور ہوتی ہے تو اس میں وہ طاقت اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ قوم غلام نہیں رہتی۔وہ معاشرے کی ہدایت کاری کرنے والی قوت بن جاتی ہے اور اپنے آزادانہ وجود کو قائم کرکے سرخرو ہوتی ہے۔انسانی آزادی کے سوال سے انسان کا تصور اجتہاد بھی وابستہ ہے اور دیگر تصورات بھی۔قرآن کے بغور مطالعے پر زور دیا اور اُمتِ مسلمہ کو قرآن و حدیث کی روشنی میں زندگی کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی تلقین کی۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

حوالہ جات

[1] سلیم اختر، اقبال ممدوح عالم، بزم اقبال کلب روڈ راول پنڈی، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۱۷،۱۱۶۔

Saleem Akhtar, *Iqbāl Mamdūḥ-e-'Ālam,* (Rawalpindi: Bazm-e-Iqbāl, 1987), p: 116,117

[2] ٹائن بی، مطالعہ تاریخ، حصہ دوم، ترجمہ غلام رسول مہر، ص: ۳۹۱۔

Tain B, *Muṭalah Tarīkh,* (Translated by Ghulam Rasūl Mehr), p: 391

[3] Dictionary of Historical Terms, (London: History Chriscook Macnillians Press, 1983), p: 245

[4] جمیل جالبی، قومی اُردو انگریزی لغت، اسلام آباد، ص: ۱۶۷۱

Jamīl Jālibī, *Qawmī Urdu Angryzī Lughat,* (Islamabad), p: 1671

[5] سورۃ البقرۃ: ۲۱۳

Sūrah al Baqarah, 213

[6] سورۃ الحجرات: ۱۰

Sūrah Al Ḥujarāt, 10

[7] رفیع الدین ہاشمی، اقبال کی طویل نظمیں، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۰، ص: ۱۳

Rafī Uddīn Hashmī, *Iqbāl kī Tawīl Naẓmeīn,* (Lahore: Globe Publishers, 1970), p: 13

[8] غلام رسول مہر، مختصر تاریخ اسلام، شیخ غلام علی اینڈ سنز، بار سوم، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص: ۳۱۶

Ghulām Rasūl Mehr, *Mukhtaṣar Tarīkh Islām,* (Lahore: Shiekh Ghulām 'Alī & Sons, 1985), p: 316

[9] محمد اقبال، کلیات اقبال اردو، اشاعت اقبال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص: ۲۰۷

Muḥammad Iqbāl, *Kuliyāt Iqbāl,* (Lahore: Sang-e-Myl Publishers, 2004), p: 207

[10] عابد علی عابد، شعر اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص: ۶۶

'Abid 'Alī 'Abid, *She'r-e-Iqbāl,* (Lahore: Bazm-e-Iqbāl, 1959), p: 66

[11] معین الدین عقیل، اقبال اور جدید دنیائے اسلام، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص: ۱۳

Mo'īn Uddīn 'Aqīl, *Iqbāl or Jadīd Dunya'-e-Islām,* (Lahore: Maktaba Ta'mīr-e- Insāniyat, 1986), p: 13

[12] محمد اقبال، ضرب کلیم، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص: ۵۲۴

Muḥammad Iqbāl, *Dharb-e-Kalīm,* (Lahore: Iqbal Academy Pakistan,2002) p:524.

[13] محمد اقبال، بال جبریل، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۵ء، ص: ۱۳۷

Muḥammad Iqbāl, *Bāl-e-Jibrīl,* (Aligarh: Educational Book House, 1975), p: 137

[14] سورۃ مریم: ۶۶

Sūrah Maryam, 66

[15] سورۃ الاسراء: ۱۸۴۔

Sūrah Al I'srā', 184

[16] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، خطبہ چہارم۔

Tashkīl Jadīd Ilāhiyāt-e-Islāmiyah, Khuṭbah Chaharam

[17] محمد عثمان، فکر اسلامی کی تشکیل نو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۰۵

Muḥammad Usmān, *Fikr-e-Islāmī kī Tashkīl-e-No,* (Lahore: Sang-e-Myl Publications,

1987), p: 105

18 سورۃ الکہف: ۲۹

Sūrah Al Kahaf, 29

19 سلیم اختر، اقبال کا ادبی نصب العین، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص: ۱۳

Salīm Akhtar, *Iqbāl ka Adabī Naṣb-ul-'Ayn*, (Lahore: Iqbal Academy Pakistan, 1977), p: 13